© rasailojaraid.com

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

معاشرہ ـــــ قرآن کے تناظر میں

مطالعۂ قرآن کے لیے منہاج یعنی وہ طریقہ جس سے قرآنی علم (علم الغایت) کے مسئلے کو حل کرنے سے نمونۂ علم (PATTERN OF KNOWLEDGE) میں یکسانی اور اشتراک فی العلم میسر آسکے، اس لیے ضروری ہے کہ منہاج نہ ہو تو فکر میں "بے نظامی" اور عمل میں "بے انضباطی" پیدا ہو کر رہتی ہے۔

چونکہ قرآنی علم غایت اور اس کے حصول کے ضامن لائحہ عمل کا علم ہے اس لیے اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم کی دعا میں مضمر نصب العین (جو بعثت کے مقصود کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا) حاصل کیسے ہو؟ لیکن انسانی استعداد کا زائیدہ علم ماہیت کا علم ہے جو علم الغایت سے اپنی نوعیت میں مختلف ہے۔ جب علم بالوحی انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھلا تو وہ تفسیر، تعبیر، تاویل، توجیہ و تعلیل کا علم بن کر رہ گیا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی اس لیے نہیں تھا کہ قرآن کا مسئلہ تو یہ تھا کہ جس نمونے پر حیات انسانی کو ڈھلنا چاہیے وہ ڈھلے کیسے اور مفسّر کا مسئلہ یہ تھا کہ قرآن کیا ہے؟ جب "کتاب" کا مفہوم لغت سے متعین ہوا تو قرآن اوامر و نواہی کا ضابطہ ہی متصور ہو سکا اور جب تک قانون قوت نافذہ سے محروم نہیں ہو گیا اسلامی اقدار کی حفاظت اور زندگی کے تقاضوں کی تکمیل اوامر و نواہی کے ضابطہ سے انحراف کے بغیر ہوتی رہی، مگر جب موثرات زندگی بدل گئے تو زندگی کے تقاضے بغیر قانون کی خلاف ورزی کے پورے نہ ہو سکے اور قانون اقدارِ حیات کی حفاظت نہ کر سکا تو زندگی جمود کا شکار ہو گئی جسے توڑنے کے لیے انحراف کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

زندگی کے انفرادی پہلو میں بے مقصدی، بے یقینی اور بے انضباطی غالب آگئی اور اجتماعی پہلو کے معاشرتی پہلو میں اخوت کی جگہ خود پسندی اور نسلی تفاخر اور معاشی پہلو میں انفاق، ایثار و احسان کی جگہ حرص و لالچ اور بخل نے لے لی، اور سیاسی پہلو میں کلمہ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی کے تحت منزل من اللہ احکام کے مطاع اور مطیعوں دونوں کے لیے یکساں واجب التعمیل ہونے کے بجائے ہوسِ اقتدار غالب آگئی اور بین الاقوامی پہلو میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی غلبۂ دینِ حق سے محروم ہو کر عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر بن گئی اور غلبۂ باطل مسلط ہو گیا۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ مذہبی ذہن اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس ہو گیا۔ اندریں صورت یہ سوال پیدا ہوا کہ قرآن میں جس کی حیثیت "حجۃ من بعد الرسل" کی ہے، دورِ مابعد رسالت میں امت کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد دوبارہ عروج حاصل کرنے کی کوئی ضمانت ہے؟ دینی اور لادینی علوم متداولہ کا روایتی انداز اس مسئلے کو حل کرنے میں رکاوٹ بنا رہا۔ اس رکاوٹ نے یہ مسئلہ پیدا کیا کہ کیا مطالعۂ قرآن کا کوئی ایسا منہاج متصور ہو سکتا ہے جو غایت نزول قرآن کے حاصل ہو کر رہنے کی ضمانت رکھتا ہو۔

قیام پاکستان کے باوجود ہماری زندگی اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی پہلوؤں میں اسلامی نمونے پر نہ ڈھل سکی۔ اس کے اسباب کیا ہیں اور ان کا تدارک کیسے ہوگا؟ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ:

- بے یقینی عام ہے۔
- قول و عمل میں تضاد ہے۔
- طبقاتی کشمکش ہے۔
- علاقائی عصبیتیں ہیں۔
- چوری ہے، ڈاکہ ہے، اغوا ہے۔
- ظلم ہے، بھوک ہے، ننگ ہے۔
- لاقانونیت ہے، تشدد ہے۔
- نیکی پامال ہے، بدی غالب ہے۔
- وعظ بے اثر ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ ہم ان آزاروں کے علاج کی آرزو سے بھی محروم ہیں، کیوں کہ اصلاح کی جدوجہد میں کامیابی کے یقین سے بھی عاری ہیں۔ یہ سب کچھ بے مقصدی کا نتیجہ ہے۔ اسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے یقینی کیوں ہے ؟

مقصد نہ ہو تو یقین کی حاجت نہیں رہتی، اور مقصد نہ ہو تو عمل کا رخ متعین نہیں ہو سکتا، اس لیے بے راہ روی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ قول و عمل کا تضاد بھی اسی لیے ہے کہ جس چیز کا دعوی کیا جا رہا ہے اس کے خلاف عمل کیے بغیر موقع پرستی اور مفاد پرستی کے ماحول میں کوئی تقاضا پورا نہیں ہو سکتا۔ فرد کے سامنے کوئی حیات بخش مقصود نہ رہے تو پہلے وہ نشاط کاری کی طرف، پھر لذت اندوزی کی طرف، پھر ہوس انگیزی، پھر معصیت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تمام جرائم اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب حیات اجتماعی کا کوئی مقصود نہ رہے تو موت وارد ہو جاتی ہے کیونکہ اجتماعی موت، جو عدم اور وجود کو برابر کر دیتی ہے، عبارت ہے غایت کی بصیرت کے خیرہ ہو جانے، نظام افکار کی روح کے فنا ہو جانے، تصور کائنات کے بے معنی ہو جانے اور فضائل اخلاق کے مسخ ہو جانے سے۔ ان چاروں خصائص کو ایک لفظ میں بیان کریں تو اسی کا نام "بے مقصدی" ہے۔

اقدار بدلتی نہیں

آج نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ اقدار بدل گئی ہیں، حالانکہ اقدار بدلتی نہیں ہیں۔ اقدار دو قسم کی ہیں، ایک وہ جو بالذات مقصود ہیں اور یہ کبھی نہیں بدلتیں۔ دوسری وہ جن کی حیثیت ذریعے کی ہے اور وہ کسی مقصود کی وجہ سے قیمت پاتی ہیں۔

مگر جب سیرت میں زوال آجائے تو اقدارِ کاملہ مفاد پرستی کے تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور اقدارِ عالیہ کو مفاد پرستی کا ذریعہ بنانے والے اپنی بے کرداری پر پردہ ڈالنے کے لیے نعرہ لگاتے ہیں کہ اقدار بدل گئی ہیں۔ معیشت کی دنیا میں ملکیت تو چیز ہی کیا ہے جس کا تقدس برقرار رکھوایا جا سکے، بڑے سے بڑا تصور بھی معاشی ناہمواریوں کو پائیدار بنانے اور بے انصافیوں کو باقی رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا تو اس کا تقدس بھی برقرار نہ رکھوایا جا سکے گا۔ ہم نے بے یقینی کی وجہ سے سوچنا بھی یہ سمجھ کر چھوڑ دیا ہے کہ جب کیسے سے کچھ ہو ہی نہیں سکتا تو سوچنے سے کیا حاصل۔ اس طرزِ عمل نے ہمیں جانور کی سطح زندگی تک گرا دیا ہے، کیونکہ انسان اور حیوان کی زندگی میں فرق صرف احساسِ ذمہ داری اور خود شعوری کا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طبقات کیا ہیں، کیا نہیں

یہ فکر و عمل کا وہی تضاد ہے جس کی بنا پر فرائض کے حوالے کے بغیر حقوق کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ طبقاتی کشمکش، جسے ہم دوسروں کے ایما پر نمایاں کرتے ہیں، سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشت کار، افسر اور ماتحت، استاد اور شاگرد کے درمیان نہیں ہے، نہ یہ طبقات ہیں۔ اگر سرمایہ دار طبقہ ہوتے تو ایک سرمایہ دار دوسرے کو تباہ کرنے کی سازش نہ کرتا۔ اگر مزدور طبقہ ہوتے تو ایک مزدور دوسرے مزدور کو قتل نہ کرتا۔ اگر زمیندار طبقہ ہوتے تو ایک زمیندار دوسرے زمیندار کو قتل کے الزام میں ملوث نہ کرتا۔ اگر کاشت کار طبقہ ہوتے تو ایک کاشت کار نالی کا پانی کاٹنے پر دوسرے کاشت کار کا گلا نہ کاٹتا۔ اگر افسر طبقہ ہوتے تو ایک افسر دوسرے افسر کے خلاف سازش کا جال نہ پھیلاتا۔ ماتحت طبقہ ہوتے تو ایک ماتحت دوسرے کے خلاف جعلی مقدمے میں شہادت نہ دیتا۔ استاد طبقہ ہوتے تو آپس میں عداوت نہ رکھتے۔ طلبہ طبقہ ہوتے تو طلبہ ہی کے خلاف تخریبی اقدامات نہ کرتے۔

طبقات کی یہ تقسیم ہی غلط ہے کیونکہ ان تمام نام نہاد طبقات میں سے ہر گروہ میں سلامتی کے طلب گار بھی موجود ہیں اور جرائم پرور اور جرائم نواز بھی انہی میں ہیں۔ طبقات اگر ہیں تو ظالموں، فاسقوں، غاصبوں، مجرموں، منافقوں اور مجرم نوازوں کے ہیں اور کوئی جرائم پیشہ اپنے ہم پیشہ کے خلاف جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ کوئی چور کسی چور کی چوری نہیں کرتا۔ کوئی رسہ گیر کسی رسہ گیر کے مویشی نہیں لے جاتا۔ کوئی ظالم کسی ظالم کے خلاف ثبوت جرم پیش نہیں کرتا۔ کوئی قانون شکن کسی ایسے شخص کا دوست نہیں ہوتا جو قانون کی پابندی کرتا ہو۔ کوئی رشوت خور کسی دیانت دار کا دوست نہیں ہو سکتا۔ کوئی بدکار آدمی سفلہ نوازی کے بغیر اپنی مراد کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان سب تخریب کاروں کی وجہ سے سلامتی کے طلب گار اس لیے خوار ہیں کہ وہ اپنی نیکوکاری کی حفاظت میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔ بدی اس لیے غالب ہے کہ منظم ہے۔ نیکی اس لیے مغلوب ہے کہ غیر منظم ہے۔ وعظ اس لیے بے اثر ہے کہ اس کے پیچھے نہ یقین ہے، نہ بصیرت ہے، نہ طاقت ہے۔

ہم اس حال میں کیوں مبتلا ہوئے؟

اس حال کو ہم جن لوگوں کی بدولت پہنچے ہیں وہ ہمارے معاشرے میں سفید پوشانہ جرائم پیشگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں باکمال جاہ پسندوں کا وہ گروہ ہے جو ہر جگہ مقبول ہے۔ سفیہانہ پست سیرتی اور سطحی ذہانت کے امتزاج سے اپنی اجارہ داریاں قائم کرنے کے لیے ہر فضیلت کو داؤ پر لگا دیتا ہے اور طلبِ زر کی مسابقت میں معاشی آسودگی کے کسی درجے کو پہنچ کر بھی بس نہیں کرتا۔ وہ جو کام خود کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اس کے وسائل پر تصرف حاصل کر کے اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ جو کام خود نہیں کر سکتا اسے ہونے ہی نہ دے۔ وہ جس کسی کی اہلیت کو اپنی اجارہ داری کے لیے خطرہ تصور کرتا ہے اس کی دشمنی میں ان کافروں سے بھی بازی لے جانا چاہتا ہے جنھیں قرآن الد الخصام (دشمنی میں شدید تر) کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ نیکی اور نکوکاری کے کسی دعوے دار سے اس گروہ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کوتاہی کسی مقام پر کبھی دیکھنے میں نہیں آتی۔

نظامِ تعلیم

نظامِ تعلیم ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے اور رکھنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ جو لوگ اس کے تحت ڈھل کر غیر ملکی اختیار سے سازگاری کے بدلے میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں، آج وہ اس میں کسی تبدیلی کے روادار نہیں ہیں۔

انتظامیہ

انتظامیہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ایتائے حقوق کا نظام ہے، مگر عملاً انتظامیہ کے جس وظیفے کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ اس طاقت کے اظہار کا ذریعہ ہے کہ ہم حقوق سے محروم کر دینے پر قادر ہیں۔

نظامِ عدل

جب تک کلمۂ طیبہ کی بنیاد پر معاہدۂ عمرانی وجود میں نہ لایا جائے جس کے نتیجے میں مطاع اور مطیع دونوں یکساں منزل من اللہ قانون کے تابع ہوں، عدل گستری کا صرف ایسا ہی نظام پیدا ہوگا جس سے جرائم ہی وجود میں آتے رہیں گے۔

اخلاقی قدروں کا فقدان

اگر ایسے احوال پیدا ہو جائیں (جو ہمارے معاشرے میں پیدا ہو چکے ہیں) کہ زندگی کا ہر تقاضہ اخلاقی قدروں کی خلاف ورزی ہی سے پورا ہوتا ہو اور معاشرے میں بدی کے ہاتھوں نیکی پامال ہو رہی ہو تو اخلاقی قدریں برقرار نہیں رکھی جا سکتیں۔ نظم و ضبط تو رضائے الٰہی کے حصول کو نصب العین بنا کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے لیے جدوجہد کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے اور خدا کا یقین ہی باقی نہ رہا ہو ـــــ جس کی شہادت یہ ہے کہ جبلی داعیات ایمان باللہ پر غالب ہیں اور طبعی خواہشات اس تاریخی تجربے پر غالب ہیں کہ ماضی میں کامیابی ضبط و انقیاد سے حاصل ہوئی تھی اور نفسیاتی تقاضے اس شعوری تقاضے پر غالب ہیں کہ ہر کامیابی کے لیے فضائل اخلاق ضروری ہیں ـــــ تو اس سے تو ایمان باللہ کی بھی نفی ہو جاتی ہے، نظم و ضبط کیا چیز ہے؟

ہماری اپنی زندگی کے اخلاقی، مذہبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی پہلوؤں کے اسلامی نمونے پر ڈھلنے میں موانع کیا ہیں اور کیسے دور ہو سکتے ہیں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جو حل ہونا چاہیے، مگر اس لیے حل نہیں ہو رہا کہ ہم غیر جانب داری سے اپنے طرز عمل کا جائزہ لینا نہیں چاہتے۔ اس سوال کے جواب میں مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ اصلاح میں سب سے بڑی رکاوٹ بے یقینی، بے اعتمادی اور قرآن سے مایوسی ہے۔

دراصل یقین اور بے یقینی دونوں تجربی توثیق و شہادت سے پیدا ہوتے ہیں۔ فتح و کامرانی کا تجربہ یقین پیدا کرتا ہے اور شکست و ناکامی کے تجربے سے بے یقینی راسخ ہوتی ہے۔ جب سے ہم تاریخی کش مکش کے نتیجے میں ناکامی کے تجربات سے گزرے ہیں، یقین و اعتماد سے محروم ہو گئے ہیں اور جب ہم اپنے زوال، اپنی بے یقینی اور بے اعتمادی کا مداوا قرآن مجید سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم قرآن کی رہنمائی سے بھی مایوس ہو جاتے ہیں، کیونکہ مطالعۂ قرآن سے آرزو غلبۂ حق کی پیدا ہوتی ہے اور مشاہدہ غلبۂ باطل کا ہوتا ہے۔ اس سے ہماری بے یقینی اور بے اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے اور بعض اوقات بعض طبقات کا قرآن پر بھی اعتماد متزلزل ہونے لگتا ہے۔

علما و صوفیا

بے یقینی اور مایوسی میں صرف عوام ہی مبتلا نہیں، علما اور صوفیا بھی، الا ماشاء اللہ اس بے یقینی اور مایوسی میں مبتلا ہیں۔ علما اور صوفیا کے مایوسی میں مبتلا ہونے کی وجہ ان کے کچھ خود ساختہ نظریات ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ "بے نیاز" ہے، جسے چاہے ہرا دے، جسے چاہے جتا دے۔ لیکن اللہ تعالیٰ بے نیاز ہو اور بندے مایوس ہوں تو عبودیت کی نسبت فنا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبودیت کی نسبت فنا ہو جائے تو یہ آرزو بھی باقی نہیں رہتی کہ ؎

ٹو میدی میں کاش اے دل تیرے بھی خدا ہوتا

دراصل اللہ تعالیٰ کی بے نیازی سے اپنی ناکامیوں کی توجیہہ ایک طرف ناکامیوں کے اسباب کے غیر جانبدارانہ تجزیے سے گریز کا اور دوسری طرف اپنی بے یقینی کے تحت "صمدیت" کے مفہوم کو مسخ کرنے کا نتیجہ ہے۔

عقائد اور مذہبی رسوم و ظواہر کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے والوں کی شکست کے اسباب عقائد کا بے جان ہو جانا، عبادات کا مردہ رسوم و ظواہر میں تبدیل ہو جانا، فرقہ پرستانہ آرزوؤں اور مفاد پرستانہ گروہ بندیوں کو پیغمبرانہ راہِ حق پرستی سمجھنا، تخیل پرستی اور کمزوری کا شکار ہو کر باطنی طمانیت کی خاطر معاشی زندگی کو ضمیر کے احساس کے مطابق راہبانہ قناعت سے بسر کرنا، معاشی تخلیق کے لیے کش مکش، منصوبہ بندی، مسابقت اور تصادم سے گریز کی بنا پر پہلے معاشی نشو و نما دینے کی صلاحیت سے، پھر اس کی آرزو سے عاری ہو جانا، بعد از مرگ زندگی کی الجھنوں کی بنا پر خدا اور آخرت کی زندگی کا یقین رکھنے والوں کا اضمحلال کی بنا پر اس زندگی کے تقاضوں سے بے نیاز ہو جانا اور انفرادی اُخروی نجات کی طرف مائل ہو کر قبل از مرگ زندگی کو قانونِ پروردگاری سے ناسازگار بناتے چلے جانا تھا۔

بخلاف اس کے تقویٰ شکن قومیں زندہ مشاہداتی علوم (جو تسخیر ماحول میں مؤثر ہیں) کے حاصل کرنے، مقصد کے حوالے سے سیرت و کردار پیدا کرنے، کائناتی ادراک کو نمایاں کرنے کی آرزو کے تحت مقصد کے شعور کے ساتھ منصوبہ بندی، مسابقت اور کش مکش میں پڑنے، تصادم کے لیے آمادہ رہنے، حقیقت پرستی اور ماحول کو سازگار بنانے کے لیے کوشاں رہنے کی بنا پر عملی زندگی کو قانون پروردگاری سے سازگار بناتی چلی گئیں۔

اقتدار سے محروم کیوں ہوئے ؟

ہم زوال پذیر مطلق العنان ملوکیت کا بدل سیاست میں اور زوال پذیر جاگیرداری نظام کا بدل معیشت میں پیدا نہ کر سکے تو برِ عظیم پاک و ہند میں ہمارا زوال ہو گیا۔ برطانوی استعمار ہمارے اوپر مسلط ہو گیا۔ چونکہ برطانوی استعمار نے اقتدار میں اپنا حریف مسلمانوں کو سمجھا تھا اس لیے ایک سلطنت کے وسائل مسلمانوں کے دل و ذہن میں اسلام کے قابلِ عمل ہونے کا اعتماد مٹانے کے لیے استعمال کیے۔ اس ضمن میں برطانوی استعمار نے ضبطیٔ اوقاف کا قانون نافذ کر کے ہمارے تمام تعلیمی، تبلیغی، اسلامی اداروں کو مالیات سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محروم کر دیا۔ شرعی عدالتوں کے ختم ہو جانے اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر لادینی نظام کے مستولی ہو جانے کا اثر یہ ہوا کہ علما معاشی ابتلا کا شکار ہو گئے اور معاشی انقلاب کی قیادت کی اہلیت سے محروم ہو گئے۔

○ حیاتِ عمرانی کی اساس فقہ کے بجائے وطن پرستی بن گئی۔

○ حیاتِ عمرانی کے تمام تقاضے (معاشرتی، معاشی، سیاسی، ثقافتی، تعلیمی) لادینی نظام سے پورے ہونے لگے۔ مذہب انفرادی، نجی، ذاتی، شخصی، باطنی زندگی کا جزو بن گیا۔

○ عقیدہ وہم میں اور عبادات رسوم و ظواہر میں تبدیل ہو کر رہ گئیں۔

○ غایت کا تصور خیرہ ہو جانے اور نظام افکار کی روح کے فنا ہو جانے سے تنظیم کا شعور مٹ گیا۔

○ اباحتی معیشت نے ہر چیز کو خریدنی اور فروختنی جنس بنا دیا۔

○ کفر کا فتویٰ، جو ایک زندہ نظامِ معاشرت سے اخراج کی سزا کی حیثیت رکھتا تھا، فرقہ پرستانہ اختلاف کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔

○ علما جو اپنے دورِ اقتدار میں قانون سازی ہی کے ذریعے مسائل حیات حل کرتے چلے آ رہے تھے، اقتدار سے محروم ہو جانے کے باوجود بھی بغیر طاقت کی قانون سازی سے دست بردار نہ ہو سکے۔

○ تمدنی نظام کا عادی ذہن تاریخی انقلاب سے گزر کر لاقانونیت کی حمایت میں اپنے خلاف طاقت کا استعمال دیکھ کر مفلوج ہو گیا۔

○ زندگی کے ہر پہلو کی قیادت جدید تعلیم یافتہ ذہن کو منتقل ہو گئی۔

○ مسلم معاشرے میں ایک شگاف پڑ گیا۔ ایک طرف مذہبی ذہن اور دوسری طرف جدید ذہن ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔

○ مذہبی قیادتوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف حصولِ آزادی کی خاطر ہندو مسلم اختلافات سے اس درجہ بے نیازی اختیار کی کہ عمرانی وحدت کے شعور کی اساس وطن پرستی بن گئی ہے۔

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

○ قرونِ اولیٰ میں پیدا ہونے والے نتائج کتاب و سنت کی پیروی کے بجائے پیغمبرانہ قیادت کے خرقِ عادات معجزات متصور ہونے لگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

○ قبل از مرگ زندگی میں قرآن کی رہنمائی کے نتائج سے مایوس ہو کر قرآنی تعلیم کے مطابق جدوجہد کے نتائج کا انحصار آخرت پر ہو گیا۔

○ اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قبل از مرگ زندگی کو ایک مشاہداتی حقیقت سمجھ کر اس کی کامیابی اور فلاح کو نصب العین کے حصول کی جدوجہد سے وابستہ کرنے اور حصولِ نصب العین کے لیے قبل از مرگ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کو ضروری سمجھنے کے بجائے یہ ذہن بنا کر اپنی کامیابی کو آخرت پر ملتوی کر دیا گیا۔

○ جدید ذہن نے دین کی تربیت مذہبی ذہن سے پائی تھی، اس لیے جدید ذہن نے اس زندگی میں ترقی کرنے کے لیے جو رہنمائی درکار تھی، اس کی توقعات دین سے منقطع کر لیں اور جدید افکار و نظریات سے مسائل حیات کو حل کرنے کا میلان پیدا کیا۔

انبیا علیہم السلام اور اصلاح انسانیت

انبیا علیہم السلام نے اصلاحِ انسانیت کی بنیاد توحید پر رکھی تھی۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ ہی کا ایک نظام، اسی کا قانون، اسی کی ذات متصرف ہے۔ اس کے مقابلے میں باطل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات نامشہود ہے۔ جب باطل کی طرف سے مزاحمت ہوتی ہے تو انسانی ذہن باطل کی (دوسری) طاقت کو مؤثر دیکھ کر مجبور ہو جاتا ہے کہ باطل کی طاقت کو اور اس کے مؤثر ہونے کو بھی تسلیم کرے۔ یہی شرک کی بنیاد ہے۔ پیغمبرانہ بعثت کا مقصد تخریبی طاقتوں کی گرفت سے انسانی فکر و عمل کو نجات دلانا ہے۔ اس کے بغیر انسانیت شرک سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔

پیغمبرانہ قیادت کا دعویٰ یہ ہے کہ کائنات میں متصرف ایک ہی نظام، ایک ہی قانون اور ایک ہی طاقت ہے اور وہ خدا کی طاقت ہے۔ جب پیغمبرانہ قیادت خدا کی ایک طاقت کا یقین دلانے کی سعی کرتی ہے تو عوامی سطح پر یہ یقین تب ہی آسکتا ہے جب پیغمبرانہ قیادت باطل کی طاقت کو شکست دینے میں کامیاب ہو۔ اس کامیابی کی شرط یہ ہے کہ جو لوگ پیغمبرانہ قیادت کی پیروی کرتے ہیں ان کے ایمان کی آبیاری کی جائے۔ ایمان کی آبیاری اس پر منحصر ہے کہ اہلِ ایمان کی زندگی کے تمام تقاضے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کی پیروی ہی سے پورے ہوں اور انھیں ان کی تکمیل کے لیے انحراف کی راہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیار نہ کرنی پڑے۔ مگر ایمان کی اس آبیاری میں پیغمبرانہ قیادت کے اس اسوۂ مبارکہ کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھتے کہ انحراف کی راہ اختیار نہ کرنی پڑے، حالانکہ اگر افراد اور معاشرہ اور ریاست اتباع ہی کی راہ سے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کا اہتمام کریں تو باطل کو شکست دی جا سکتی ہے۔

دینی فکر میں اختلال

غایت نزولِ قرآن کے باب میں مذہبی ذہن کا التباس بھی دینی فکر میں اختلال کا ایک اہم سبب ہے، جس کے نتیجے میں دو موقف اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ نزولِ قرآن کا مقصد صرف اخلاقی اصلاح کرنا ہے۔ یہ ہو جائے تو باقی نتائج از خود پیدا ہو جائیں گے۔ دوسرا موقف یہ ہے کہ قرآن زندگی کے ہر پہلو میں ہدایت دینے کے لیے نازل ہوا ہے۔

پہلے موقف کی رو سے دین کی ماہیتِ اصلی فضائلِ اخلاق متصور ہوتے ہیں، جن کے بارے میں رائے یہ ہے کہ وہ تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ اس موقف کا ایک نتیجہ تو "وحدت ادیان" ہے اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب ایک بالذات فضیلت کی حیثیت سے مسلّم نہیں رہتا اور تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ توحید کی حیثیت بھی فضائل اخلاق کے ایک ذریعے کی ہو کر رہ جاتی ہے، مگر جب عقلی بنیاد پر اخلاق کو اس انداز سے سمجھا جائے کہ فرض کو فرض کی خاطر بجالانا اخلاق ہے تو بت پرستی اور انکار توحید سے بھی اس مذہب کے سازگار ہونے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے جس کی ماہیتِ اصلی فضائلِ اخلاق ہوں اور اس موقف نے اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا کہ :

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را   وقت ست دگر بت کدہ سازند حرم را

حالانکہ مذاہب میں فضائلِ اخلاق مشترک نہیں ہیں۔ اس کا اندازہ ہر مذہب کی رو سے راس الحسنات (ام الفضائل) کو سمجھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہندو مت کی رو سے راس الحسنات "عجز و انکسار" ہے۔ بدھ مت کی رو سے سب سے بڑی نیکی "ہمدردی" ہے۔ یہودیت کی رو سے ام الفضائل "تشرع" یعنی لفظِ قانون کی پیروی ہے اور مسیحیت کے نزدیک "رحم دلی" سب سے بڑی نیکی ہے اور ان سب نیکیوں پر "فریب مقدس" کے طور پر عمل ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کی رو سے "اخلاص" یعنی اخلاقی حکم کی بجا آوری میں نیت کا ہر آلائش سے پاک ہونا ہی "راس الحسنات" ہے۔ یہی حسنِ نیت ہے اور یہی حسنِ عمل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحدتِ ادیان سے ایک اور مشکل پیدا ہوتی ہے کہ وہ اخلاقی فضیلت جو دوسرے مذہب کی پیروی سے پیدا ہوتی ہے، مثلاً ہندو عورت کی "عصمت"، وہ قابلِ قبول ہوگی یا نہیں؟ اگر قابلِ قبول نہ ہو تو یہ ایک خود پسندانہ بے انصافی ہوگی اور قابلِ قبول ہو تو اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام کے معنی کیا ہوں گے؟

دوسرے موقف کی رُو سے نزولِ قرآن کا مقصود مکمل دستورِ حیات مہیا کرنا ہے۔ یہ مکمل دستورِ حیات تعبیرِ نصوص سے میسّر آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور مفسّر کی رائے یہ ہے کہ قرآنِ مجید اصول مہیا کرنے والی کتاب ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ مکمل ہدایت نصوص سے نہیں تعبیرِ نصوص سے میسر آتی ہے اور تعبیر انسانی ذہن کی تراشیدہ ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ "نص" نہیں، تعبیر ہدایت ہے۔ دوسری دشواری یہ ہوگی کہ اہل السنۃ کے نزدیک چاروں فقہی مسلکوں کو روا رکھنے کے لیے تعبیر میں اختلاف جائز ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر اختلاف کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مشکل یہ ہے کہ جب سے ہمیں ان لوگوں کے مقابلے میں ناکامی ہوئی ہے جن کے پاس یہ ہدایت کا ملہ نہیں ہے، ہم اپنی ناکامی کی تلافی نہیں کر سکتے۔ یہ صورتِ حال قرآن سے مایوسی اور بے یقینی میں اضافہ کرتی ہے۔

مگر جب سے معاشی انقلاب کی قیادت ہمارے ہاتھ سے چھنی اور سلاطین اقتدار سے اور قانون قوتِ نافذہ سے محروم ہوا اور موثراتِ زندگی (علم اخلاق، مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست) میں تغیرات پیدا ہوئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کے تقاضے صرف فقہی قانون کی خلاف ورزی سے پورے ہونے لگے۔ فقہی ضابطے کی پابندی کرانے کے لیے واعظین کے پاس عذابِ آخرت سے ڈرانے کے علاوہ کوئی حربہ باقی نہیں رہا۔ زندگی کے تقاضے فقہی احکام کی خلاف ورزی کے بغیر پورے نہ ہو سکے تو عذابِ دوزخ کا خوف بے اثر ہو کر رہ گیا۔ مذہبی ذہن اب بھی قانون سازی ہی سے زندگی کی اصلاح کرنے پر مصر ہے جس کی خلاف ورزی کے بغیر زندگی کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور وعظ کے بے نتیجہ ہو جانے سے علما کا اعتماد اپنے طریق کار اور اس کی نتیجہ خیزی کے باب میں متزلزل ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام پر معاشی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے غیر محفوظ ہونے کا احساس غالب ہے۔ وعظ ان کے لیے بے اثر ہو چکا ہے۔ انھیں حضورِ قلب سے نفرت ہو گئی ہے۔ طلبِ زر میں دھوکا کھانا ان کی نفسیات بن گئی ہے۔ علما صرف واعظانہ شیوہ بیانی اور خطیبانہ شعلہ نوائی سے عوام کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصلاح میں ناکام ہو کر خود بے یقینی، بے اعتمادی اور مایوسی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ عوام نہ مصلحینِ امت اور اشتراکی انقلاب کے داعیوں کے لیے میدانِ عمل ہیں۔ عوام اپنی احتیاج اور نفسیاتی میلان کی بدولت دھوکا کھانا چاہتے ہیں اور اشتراکی انھیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ اشتراکی اپنے طریقِ کار کی نتیجہ خیزی کے بارے میں وثوق اور اعتماد پیدا کرتے جاتے ہیں اور علما اپنے طریقِ کار کی بے تاثیری سے اپنی بے یقینی میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔

دراصل اس صورتِ حال کا سبب یہ ہے کہ ہم اخلاقی اصلاح اخلاقیات سے، معاشرے کی اصلاح عمرانیات سے، معیشت کی اصلاح معاشیات سے اور سیاسی پہلو کی اصلاح سیاسیات سے کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کے لیے قرآن مجید کے بجائے انسانی استعداد کے زائیدہ علوم سے ہدایت طلب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم مطالعۂ قرآن کے ایک ایسے منہاج کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکے ہیں کہ جس کی بدولت نزولِ قرآن کی غایت کو سمجھا جا سکے اور اسے حاصل کیا جا سکے۔ کیونکہ اللہ پاک تو فرماتا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا۔ مگر ہم نے "شرع" پر اپنی توجہ مرکوز کر لی اور "منہاج" کو اس لیے نظر انداز کر دیا کہ شرع پر توجہ مرکوز کرنے سے نتائج پیدا ہو رہے تھے۔

اب حالت یہ ہے کہ اخلاق کا معیار تو ارسطو کی پیروی میں حکم کے بجائے افراط و تفریط کے درمیان نقطۂ اعتدال بن گیا ہے، معاشرے میں اساسِ اجتماعیت توحید و رسالت کے بجائے وطنیت یا نسلیت بن چکی ہے، معیشت میں انفاق و ایثار اور بذل و عطا کی جگہ حرص، لالچ اور بخل نے لے لی ہے اور سیاست میں "کلمۂ طیبہ پر مبنی معاہدۂ عمرانی" کے بجائے ہوسِ اقتدار غالب ہے اور سیاسی طالع آزما، ہوسِ اقتدار کے ذہنی مریض، قرآنِ مجید کی اس رہنمائی کے باوجود کہ: اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط (الانعام: ۱۱۶) جمہوریت کو ہوسِ اقتدار کی تسکین کا "دکھل جا سم سم" سمجھ کر جمہوریت ہی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر حالت یہ ہے کہ عالمِ اسلام سینتالیس با اقتدار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا ہے، جس کے ہر معاشرے میں شگاف پڑ چکے ہیں۔ ایک طرف نام نہاد راسخ العقیدہ ذہن ہے جو اپنے آپ کو علمِ دین کا وارث ہونے کی بنا پر اقتدار کا حق دار سمجھتا ہے اور اقتدار سے محرومی کے احساس میں مبتلا ہے۔ دوسری طرف جدید ذہن کا حامل گروہ ہے جو اقتدار پر قابض ہے اور باوجودیکہ اس کی حیثیت اساطینِ جدید کے مقابلے میں وہ بھی نہیں جو سرکس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے جانور کی رنگ ماسٹر کے تعلق میں ہوتی ہے، وہ اپنے آپ کو "جدید" سمجھتا ہے۔ جب جدید ذہن کو اپنے نام نہاد راسخ العقیدہ ہم وطنوں کے مقابلے میں اپنے اقتدار کی حفاظت مطلوب ہوتی ہے تو وہ عالمِ کفر سے اپنی تائید طلب کرتا ہے اور یوں مسلم ممالک کی مقتدر قوتیں عالمی سطح پر دو متخاصم سپر طاقتوں میں سے کسی ایک کو اپنے لیے حلیف منتخب کرتی ہیں اور ایک دوسرے کی عداوت میں محاذ آرائی کر کے مسلم کشی کی جنگ میں مصروف ہوتی ہیں اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتی ہیں کہ وہ کس کی جنگ لڑ رہی ہیں۔

مسلمان اس حالت کو کیوں پہنچے؟

اس حالت کو پہنچنے کا سبب یہ ہے کہ مسلم قیادتیں، خواہ مذہبی ذہن کی حامل ہوں یا جدید ذہن کی، مقصدیت اور حصولِ مقصد کے لیے قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کے یقین سے محروم ہیں اور بے یقینی کے اعتراف، یقین کی احتیاج اور اسے پورا کرنے کی تدبیر سے بے نیاز ہیں اور قرآنی ہدایت کے برعکس "روحِ عصر" کے تقاضوں کی کورانہ تقلید سے اسی نظریاتی بحران (IDEOLOGICAL CRISIS) کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے جس میں منزل من اللہ ہدایت سے انحراف کے نتیجے میں باقی دنیا گرفتار ہوئی ہے۔

ہر مسلم معاشرے میں ایک تیسرا گروہ ہے جو مذہبی ذہن اور جدید ذہن کے افکار و نظریات کے درمیان تطبیق اور معذرت کو شانہ ہم آہنگی پیدا کر کے حصولِ اقتدار کی راہ ہموار کرنے میں مصروف ہے۔

قرآن کو صحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کرنے والا قانون ساز مذہبی ذہن مؤثرات زندگی میں تبدیلی کے نتیجے میں قانون کے بے اثر ہو جانے کی صورت میں امم سابقہ کے رہبان و احبار کی طرح ہر آزار کا علاج خود ساختہ قوانین ہی سے کرنا چاہتا ہے، حالانکہ زوالِ سیرت کی ہمہ گیری کے نتیجے میں جو اقدارِ حیات مٹ گئی ہیں ان کو پیدا کرنا تو قانون کا وظیفہ نہ پہلے تھا نہ اب ہے، کیونکہ قانون کا وظیفہ مٹی ہوئی اقدار کو پیدا کرنا نہیں۔ اگر اقدار موجود ہوں اور قانون کو قوتِ نافذہ میسر ہو تو قانون صرف اقدار کی حفاظت کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ نابود نہ ہو گئی ہوں۔ مگر جب قانون کی پیروی کی امنگ باقی نہ رہی ہو تو اقدارِ حیات کا احیا قانون سے متصور ہی نہیں ہو سکتا۔

روحِ عصر کی جس کورانہ تقلید نے ہمیں "نظریاتی بحران" میں مبتلا کیا ہے، وہ یہ ہے کہ:

○ ذریعۂ علم صرف حواس ہیں، جس کے نتیجے میں محسوسات ہی حقیقت متصور ہوتے ہیں اور محسوسات میں طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضے ہی اہم ترین حقیقت ہیں۔ لہٰذا جغرافیائی وحدت ہی عمرانی وحدت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعور کی بنیاد بن جاتی ہے۔

٥ معاشی مفاد ہی اہم ترین مفاد ہے۔

٥ سیاسی تصور ہی سب سے زیادہ ولولہ انگیز تصور ہے۔

اگر ماورائی حقائق کے افکار کے بجائے ہم نے قرآنی ہدایت کے نتائج کی تجربی توثیق و شہادت کو یقین کی اساس تصور کیا ہوتا تو ہم کبھی بے یقینی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے۔

اگر ہم نے معاشی مفاد کو اہم ترین مفاد سمجھ کر حرص، لالچ اور خود غرضی میں مبتلا ہونے کے بجائے معاشی نشو و نما دینے کو اہم ترین مفاد سمجھا ہوتا تو ہم خود غرضی میں مبتلا ہو کر اپنے ہی لوگوں کا معاشی استحصال نہ کر رہے ہوتے اور معاشی انقلاب کی قیادت سے محروم نہ ہو گئے ہوتے۔

اور اگر ہم نے سیاسی تصور کو جدید اقوام کی پیروی میں سب سے زیادہ ولولہ انگیز تصور نہ سمجھا ہوتا تو ہم ان کی پیروی میں اپنے ہی لوگوں کا سیاسی استحصال کرنے کے بجائے سیاسی نشو و نما دینے کا ولولہ پیدا کرتے۔

اب نظریاتی بحران میں مبتلا دورِ جدید کی طرف سے قرآن مجید کے لیے یہ ایک چیلنج ہے کہ :

٥ کیا قرآن نظریاتی بحران کا حتمی علاج پیش کر سکتا ہے ؟

اس چیلنج کو قبول کرنے کی شرط اس سوال کا جواب دینے سے پوری ہوگی۔

٥ قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر قرآن مجید تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے تمام پہلوؤں میں سے ہر پہلو کے تمام تقاضے پورے کرنے کی ضمانت رکھتا ہے ؟

یہ خصوصیت قرآن مجید کا حجۃ من بعد الرسل ہونا ہے۔

© rasailojaraid.com